چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے افسانوی ادب کا تقابلی مطالعہ

سارہ عنبر *

Abstract:
Shaukat Siddiqui, a great Urdu writer, is often compared to Charles Dickens in his depiction of social reality. Hence in this paper, a comparison of Shaukat Siddiqui nad Charles Dickens is undertaken. The comparison aims at showing not only the similaries in the portrayal of social inequalities, but also the differences not previously recognised at all. The major difference that has been presented in this study of the two writers is that Charles Dickens was optimistic and hopeful whereas Shaukat Siddqui's outlook is pervaded by apessimism.

ادب میں تقابلی مطالعہ (Comparative Study) کی اہمیت سے چنداں انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی نقاد انفرادی ادیب کے ادب پر تنقید کرتے رہتے ہیں کسی ایک زبان اور ایک ثقافت کے نمائندہ ادیب کا تنقیدی جائزہ ادب کی دنیا میں کوئی نئی بات نہیں، اس کے برعکس دو مختلف زبانوں، صدیوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے فن کا ایک دوسرے کے ساتھ تقابلی جائزہ بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تقابلی مطالعہ ادب کی وہ شاخ ہے جو ادب کا آفاقی سطح پر تجزیہ کرتا ہے اور ادبی افق کو قاری کے ذہن میں مزید نمایاں کرتا ہے۔

موجودہ مقالہ چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے فن کا بطور ''معاشرتی ناول نگار'' تجزیہ کرتا ہے۔ شوکت صدیقی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ معاشرتی اور معاشی نا انصافیوں کی تصویر کشی عہدِ وکٹوریہ (1837-1901) کے انگریزی ناول نگار چارلس ڈکنز کے سٹائل میں کرتے ہیں۔ موجودہ مقالے میں دونوں ادیبوں میں پائی جانے والی مماثلت اور امتیازات کو اس طرح سے اُجاگر کیا گیا ہے کہ قاری دونوں ادیبوں میں موجود ایک ایسے واضح فرق کو محسوس کر سکتا ہے۔ جسے پہلے کسی اردو کے نقاد نے محسوس نہیں کیا ہے۔ یعنی ڈکنز معاشرتی نا انصافیوں کی تصویر کشی انتہائی رجائی اندازِ فکر کے ساتھ کرتا ہے جبکہ صدیقی کے ہاں یاسیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

چارلس ڈکنز 7 فروری 1812ء کو Portsmouth کے نزدیکی علاقہ Portsea میں پیدا ہوا(1)۔ اس کا

* لیکچرر اُردو، گورنمنٹ فیڈرل کالج برائے خواتین، ملتان۔

باپ John Dickens بحری Pay Office میں کلرک تھا(2) ۔ یہ خاندان اقتصادی طور پر غیر مستحکم صورتحال کا شکار تھا۔ابھی ڈکنز دس سال کا تھا کہ اس کا باپ مقروض ہوکر قید کرلیا گیا۔تنگدستی کو مٹانے کے لیے ڈکنز کو دس سال کی عمر میں سکول کو خیر باد کہنا پڑا۔

> ڈکنز کو سکول سے اُٹھا دیا گیا۔اُسے گھریلو گھٹیا کاموں پر لگا دیا گیا۔
> خاندان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے اُسے Blacking
> Factory میں گنوار ساتھیوں کے ساتھ کام کرنا پڑا''(3)۔

ذاتی محرومیوں اور مسلسل جدوجہد کے علاوہ غربت کے مارے ہوئے اور مظلوم لوگوں کے پیہم مشاہدے نے ڈکنز پر ایسا اثر ڈالا کہ اس نے اپنے ناولوں میں اسی طبقے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

چارلس ڈکنز نے بطور ناولسٹ کے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1836ء میں "Sketches by Boz" سے کیا۔ یہ ایک سلسلہ وار تخلیق تھی۔جس میں لندن کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ڈکنز کی دوسری تخلیق "Pickwick Papers" نے عوام کی توجہ کو گرفت میں لے لیا اور اس کو ناول نگاری کی صف میں رہنما بنا دیا۔ یہ ناول 1836ء سے 1837ء تک سلسلہ وار چھپتا رہا۔ڈکنز نے ایک ایسے ناول کی بنیاد رکھی جس نے برطانوی عوام میں نشاط انگیز ہنگامی کیفیت پیدا کردی۔ یہ کتاب Pickwick اور اس کے ساتھیوں Winkle, Snodgrass, Tupman اور Samweller کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ کس طرح قسمت کی ستم ظریفی کی بدولت مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔اور ان مشکل مراحل کو تجربہ کار مہم جو Pickwick کی بدولت خوش تدبیری اور مہارت سے حل کرتے ہیں۔

ابھی "Pickwick Papers" اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی بدولت تکمیل کے مراحل میں تھا کہ ڈکنز ایک رسالے "Bentley Miscellany" کا ایڈیٹر بن گیا۔ جس میں اس نے ناول "Oliver Twist" (1837-38) کو لکھنا شروع کیا۔اس ناول کا مرکزی خیال بچپن کے غم اور دکھ کے مقابلے میں جرائم پیشہ افراد اور جیب کترے Fagin اور اُس کے رفیق جرم Monks, Bill Sikes اور Nancy کے کرداروں کو اُجاگر کرنا ہے۔ناول "Oliver Twist" مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کی عکاسی کرتا ہے۔"Oliver Twist" کی تکمیل سے پہلے ڈکنز نے اپنے ایک اور ناول "Nicholas Nickleby"(1838-39) کی اشاعت شروع کرا دی۔ یہ اصلاحی ناول تھا۔اس ناول میں Yorkshire کے بیشتر سکولوں کے طریقہ تعلیم پر طنز کیا گیا ہے۔ یہ ناول Squeers جیسے ظالم اساتذہ پر نکتہ چینی کرتا ہے۔1840ء میں ڈکنز نے متفرق مضامین پر مشتمل کتاب "Master

"Humphrey's Clock" لکھنا شروع کی جو اُس کی دوسری سلسلہ وار کتاب "Old Curiosity Shop" (1840-41) کے لیے بنیادی خاکہ ثابت ہوئی۔ اس ناول میں ڈکنز نے Nell نامی لڑکی اور اس کے دادا کی دردناک زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ جو اقتصادی مسائل کا شکار ہیں۔ ناول "Barnaby Rudge"(1841) تاریخی اور رومانوی ناول ہے۔ جو Gordon کی طرف سے Pope کے خلاف بغاوتوں کے متعلق ہے۔ یہ بغاوتیں 1780ء میں واقع ہوئی تھیں جنہوں نے انگلینڈ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس ناول میں بُرے اور گمراہ پادریوں اور خودغرض عوامی اداروں کے درمیان تعلق کا معائنہ کیا گیا ہے۔

1842ء میں ڈکنز اور اس کی بیوی نے امریکہ کا سفر کیا۔ اس سفر کے نتیجے میں اُس نے ناول "Martin Chuzzlewit"(1843-44) لکھا۔ اس ناول کا شمار ڈکنز کے اعلیٰ معیار کے ناولوں میں نہیں ہوتا۔ بار بار پڑھنے سے بھی اس کے واقعات کی ترتیب ذہن نشین نہیں ہوتی۔ یہ ناول Martin Chuzzlewit کی امریکہ اور انگلینڈ میں مہمات پر روشنی ڈالتا ہے۔

ناول "Dombey and Son"(1846-48) غرور کے اثرات اور مزاج کے متکبرانہ انداز پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگر "Martin Chuzzlewit" کا مقصد خودغرضی کو تمام بھیسوں میں منظر عام پر لانا تھا تو "Dombey and Son" کا موضوع فخر تھا۔ یہ ناول "Martin Chuzzlewit" کی نسبت زیادہ مربوط ہے اور ڈکنز کے ابتدائی ناولوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ڈکنز کے بعد کے لکھے گئے ناولوں میں "David Copperfield" اہم ناول ہے جو 1849ء سے 1850ء کے عرصے میں لکھا گیا۔ اس ناول کو ڈکنز کی خودنوشت سوانح عمری کہا جا سکتا ہے۔ ڈیوڈ کی زندگی اور اُس کی مہمات حقیقت میں ڈکنز کی زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ ناول میں معاشرتی اونچ نیچ، خوشیوں اور غموں کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ لیکن اس ناول میں خوشیاں دائمی لے کا مقام رکھتی ہیں۔ ڈکنز کا ناول "Bleak House" 1853ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول ناجائز عدالتی قوانین خاص طور پر "Chancery" کی عدالت پر بھرپور طنز ہے۔ عدالتوں کی فیصلوں میں تاخیر اور غیر منصفانہ فیصلوں پر جتنے واضح انداز میں یہ ناول روشنی ڈالتا ہے عہدِ وکٹوریہ (1837-1901ء) کے کسی ناولسٹ کے ہاں نہیں ملتی۔ ڈکنز کا ناول "Hard Times"(1854ء) صنعت کاروں اور دولت کے پجاریوں پر بھرپور طنز ہے۔ ناول کے دو کردار Gradgrind اور Josiah Bounderby ڈکنز کے طنز کا نشانہ ہیں۔ یہ ناول مادی اشیاء سے نفرت دلاتا ہے اور انسانی زندگی میں روحانی اقدار کو بلند کرتا ہے۔ ناول "Little Dorrit"(1855-57) گورنمنٹ کی جیلوں

اور قیدیوں کی طرف سے عدم توجہی اور بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار William Dorrit کو اپنی زندگی کے کئی سال Marshalsea کے قید خانے میں گزارنا پڑے William Dorrit کے تجربات کے ذریعہ جیل کی بدترین زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ گورنمنٹ کی ، اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ قیدیوں کی تلخ اور دکھ بھری زندگی میں اُمید کی کرن اور زندگی گزارنے کی رمق پیدا کی جائے 1859ء میں ڈکنز نے انقلابِ فرانس کے پس منظر میں ایک ناول "A Tale of Two Cities" لکھا۔ ناول میں بتائے گئے دوشہر لندن اور پیرس ہیں۔ یہ ایسا انقلاب تھا جس نے پورے یورپ کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ اس ناول میں امرا اور نوابوں کے مظالم کو بے نقاب کیا گیا ہے جس کے سبب غریبوں کے دلوں میں امیروں کے خلاف نفرت شدید سے شدید تر ہو گئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ غریب عوام اُمرا کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے یہ ناول ادبی اور تاریخی لحاظ سے بلند تر درجے کا حامل ہے۔

ڈکنز کے ناول "Great Expectations"(1860-61)ء میں قید خانہ نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ ڈکنز کا یہ ناول طنزیہ اسلوب کا حامل ہے کیونکہ ناول کے ہیرو Pip کی معاشرے میں اعلیٰ مقام کی بنیاد ایک مجرم کی دولت پر ہے۔ اس ناول میں ڈکنز نے نجات کا مقام اچھے اور دیانتدارانہ کام پر رکھا ہے "Our Mutual Friend" (1864-65) ڈکنز کا آخری مکمل ناول ہے۔ اس ناول میں ڈکنز نے دولت کو پورے معاشرے کی خرابی کا باعث قرار دیا ہے۔ ڈکنز کی آخری تخلیق "The Mystery of Edwin Drood"(1870)ء ہے۔ یہ نامکمل ناول ہے۔ یہ ناول دوہری فطرت والے قاتل John Jasper کی ذاتی بیماری کے متعلق ہے ناول میں مجرم کو ایک دُکھی انسان سمجھا گیا ہے جو اعلیٰ مرتبے سے گرنے کے باوجود ہمدردی کا مستحق ہو۔

ڈکنز نے چونکہ اپنے دور کے حالات اور لوگوں کے متعلق لکھا ہے۔ اس لیے اُس دور کا سمجھنا انتہائی مفید ہے جس میں اُس نے زندگی بسر کی اور ادبی کام کیا۔

اُنیسویں صدی مسلسل تبدیلیاں رونما ہونے اور زندگی کے ہر میدان میں ترقی کا دور ہے۔ یہ دور مادی ترقی ، سائنسی بیداری، جمہوری اصلاحات، صنعتی اور میکانکی ترقی کا دور تو تھا لیکن معاشرتی انتشار عہدِ وکٹوریہ (1837-1901ء) کی نمایاں خصوصیت بن چکا تھا صنعتی انقلاب جہاں صنعت کاروں اور مل مالکان میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہاں مزدوروں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی تعداد میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی قسمت کی ستم ظریفی پر حیران تھے۔ انہیں نہ تو پیٹ بھر خوراک ملتی تھی اور نہ ہی رہنے کے لیے مناسب جگہ تھی۔ وہ گندے تاریک

علاقوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔اُمراء کے دل پتھر کے بن چکے تھے وہ معصوم بچوں سے اُن کی استطاعت سے بڑھ کر کام لیتے۔یہی وجہ تھی کے غریب عوام ذہنی اور روحانی الجھنوں کا شکار ہو گئے۔صنعتی انقلاب اگر چہ مال و دولت کی پیداوار تو کر رہا تھا لیکن انگلینڈ میں معمولات زندگی پر افسوسناک حد تک اثر انداز ہوا۔شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔کیونکہ لوگ دیہاتوں سے ہجرت کر کے شہروں میں آباد ہو گئے۔آئرلینڈ سے مفلس لوگوں نے ہجرت کی تو اس طرح ہزاروں محنت کش بیماری، بھوک و افلاس کا شکار ہو گئے۔کارخانوں میں اشیاء بننے لگیں۔جس کی وجہ سے کارکنوں کی ضرورت بہت حد تک کم ہوگئی۔اور نتیجتاً بیروزگاری وقوع پذیر ہوئی محنت کشوں میں اضافے کی وجہ سے معاوضے میں کمی واقع ہوگئی۔خاندان کے تمام افراد (چھوٹے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک) کو زندہ رہنے کے لیے فیکٹریوں، اُون کے کارخانوں، کوئلے کی کانوں اور کپاس کی ملوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔کارخانے کے مالک بچوں کا استحصال کرتے۔معمولی سی رقم کی خاطر نو سال کے بچوں کو روزانہ بارہ سے چودہ گھنٹے ملوں میں کام کرنا پڑتا۔وہ مشینوں سے چمٹے رہتے یا کوئلوں کی کانوں میں چھکڑوں کو کھینچتے پھرتے۔ان کی انگلیاں زیادہ عمر والوں کے مقابلے میں چھوٹی اور پھرتیلی تھیں جس سے وہ کپاس اور اُون کو بڑی تیزی سے اکٹھا کرتی تھیں اس لیے مالکان بچوں کو ملازم رکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔

رضی عابدی لکھتے ہیں:

> ''انیسویں صدی، مغرب میں دیرینہ قدروں کے ٹوٹنے کی صدی ہے۔''(4)

یہ حیرت کی بات نہیں کہ انسانی دکھ میں شامل بچوں نے ڈکنز پر بطور مصنف اور معاشرتی مصلح بڑا اثر ڈالا۔ وجہ یہ تھی کہ ڈکنز کا بچپن بھی نہایت ناخوشگوار گزرا تھا۔چنانچہ اس صدی کی ناانصافیوں اور معاشرتی دشواریوں کو اُس نے نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے۔58 برس کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے وہ 1870ء میں انتقال کر گیا اور اسے Westminister Abbey کے Poet's Corner میں دفنا دیا گیا۔

شوکت صدیقی 20 مارچ 1923ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔وہ ایک متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے پولٹیکل سائنس میں ایم۔اے کیا۔انہیں بچپن سے ہی ادب کے ساتھ لگاؤ تھا۔انہوں نے 17 سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔انہوں نے بہت سے ناول اور افسانے لکھے۔اُن کے افسانے اور ناول معاشرتی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔قیام پاکستان کے بعد شوکت صدیقی پاکستان آ گئے۔یہاں آکر انہیں بے شمار معاشی

مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان مسائل کو انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔شوکت صدیقی نے ان کچے کرائے کے مکانوں میں جرائم پیشہ افراد کے ساتھ زندگی بسر کی اور اُن کی نفسیات کا مطالعہ کیا۔اِن جرائم پیشہ افراد کو انہوں نے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔اُن کے نزدیک ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی گمراہیوں اور مجرمانہ ذہنیت کا سبب اعلیٰ طبقہ کی بے حسّی ،ظلم وجبر اور حد سے بڑھی ہوئی زیادتیاں ہیں۔

پاکستان آنے کے بعد اُنہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا وہ 54-1952 تک ''پاکستان سٹنڈرڈ'' کے سب ایڈیٹر رہے۔60-1954ء تک ''روزنامہ ٹائمنر آف کراچی'' کے سب ایڈیٹر رہے۔ 63-1960ء تک ''مارننگ نیوز'' کراچی کے سب ایڈیٹر رہے۔66-1963 تک روزنامہ ''انجام'' کے ایڈیٹر رہے اور بعد میں چیف ایڈیٹر مقرر کر دیئے گئے۔73-1969ء کے دوران ہفت روزہ ''الفتح'' کے نگرانِ اعلیٰ کے طور پر کام کیا۔79-1973ء تک روزنامہ ''مساوات'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔1984ء میں صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اب تخلیق ادب پر توجہ مرکوز ہے۔

شوکت صدیقی نے ان صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں کو بھی جاری رکھا۔اُن کے چار افسانوی مجموعے،ایک ناولٹ اور تین ناول اب تک شائع ہو چکے ہیں۔جن میں ''کمین گاہ'' ناولٹ (1945ء)، ''تیسرا آدمی'' افسانے (1952ء) ،''اندھیرا اور اندھیرا'' افسانے (1955ء)، ''راتوں کا شہر'' افسانے (1956ء) ،''خدا کی بستی'' ناول (1957ء)، ''کیمیا گر'' افسانے (1984ء) ، ''چار دیواری'' ناول (1988ء)، ''جانگلوس'' ناول (1989ء) شامل ہیں۔

اُن کے ناول ''جانگلوس'' اور ''چار دیواری'' رسائل میں قسط وار شائع ہوتے رہے جنہیں بعد میں کتابی صورت دے دی گئی۔شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' کے ۴۷ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔یہ ناول اردو ادب کے شاہکار ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔دنیا کی چھبیس مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔اس ناول کو پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔شوکت صدیقی کو 1960ء میں ناول ''خدا کی بستی'' پر آدم جی ادبی انعام دیا گیا۔ ''جانگلوس'' لکھنے پر اُنہیں حکومت نے 1997ء میں پرائڈ آف پرفارمنس کے ایوارڈ سے نوازا۔2003ء میں انہیں ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ستارۂ امتیاز دیا گیا۔

شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس'' میں پاکستانی معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ان ناولوں میں غریبوں کے استحصال کو بنیادی موضوع بنایا گیا ہے۔''خدا کی بستی'' میں پاکستان بننے کے فوراً بعد ہمارے وطن کی

حالتِ زار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔اور ''جانگلوس'' پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ پر محیط ہے۔وطن پاکستان میں تقریباً نصف صدی کے دوران میں اعلیٰ طبقہ کی طرف سے ادنیٰ طبقہ کا استحصال اور زیردستوں پر وڈیروں اور جاگیرداروں کے مظالم کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ناولٹ ''کمین گاہ'' اور ناول ''چار دیواری'' ہندوستان کی معاشرتی حالت کی متحرک تصویریں ہیں شوکت صدیقی کے افسانوں پر بھی ان کی ناولوں کی چھاپ ہے۔ ان کے افسانے بھی معاشرتی استحصال کی عکاسی کرتے ہیں۔ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں۔

> ''اُنہوں نے ہمیشہ غربت، استحصال، جہالت اور محلاتی سازشوں کے خلاف قلم اُٹھایا...... وہ ہماری اجتماعی زندگی کا بے رحم مفسر،مبصر اور ناقد ہے۔''(5)

شوکت صدیقی کے ناول اور افسانے زندگی کی تلخیوں اور ظلم و جبر کے خلاف منہ بولتا ثبوت ہیں۔شوکت صدیقی کے فن کو سمجھنے کے لیے اُس دور کو جاننا انتہائی ضروری ہے جس میں اُنہوں نے آنکھ کھولی۔جس زمانے میں وہ پیدا ہوئے اُس وقت ہندوستان کے عوام غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے وہ ان زنجیروں کو توڑنے کے لیے شدت سے مضطرب تھے۔

شوکت صدیقی نے ہوش سنبھالا تو سیاسی اور مذہبی تحریکیں زور پکڑنے لگیں اور آزادی کا جذبہ بڑھتا چلا گیا جبکہ ہندو مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے پر تلے ہوئے تھے۔وہ اکھنڈ بھارت کو گاؤ ماتا سے تشبیہہ دیتے تھے اور برصغیر پاک و ہند کو تقسیم کرنے کے خلاف تھے۔پاکستان بالآخر 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر نمودار ہو گیا۔ ڈاکٹر نجم الاسلام لکھتے ہیں:

> ''آزادی کے بعد اس ملک کے حق میں ابتلا و آزمائش کا ایک باب کھل گیا۔اپنے دلوں میں لوگوں نے شدت محسوس کرنا شروع کر دیا کہ منزل مقصود ابھی نہیں آئی۔منزل ابھی نہیں آئی۔''(6)

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی عوام کا استحصال جاری رہا۔اب استحصال کرنے والے انگریز یا ہندو نہ تھے بلکہ مسلمان خود دوسرے مسلمان کا استحصال کرنے میں پیش پیش تھے۔اب عوام پر ظلم جاگیرداروں،سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی طرف سے ہوا۔

دوسری طرف کارخانہ داروں اور صنعت کاروں نے مزدوروں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔اُنہیں اپنی محنت کا

سواں حصہ بھی بمشکل ملتا۔ یہ مظلوم اپنے دن بھر کی کمائی سے ایک وقت کی روٹی بھی بمشکل حاصل کر سکتے تھے۔ تنگ آ کر اگر کبھی وہ احتجاج کرتے تو اُن پر لاٹھیاں برسائی جاتیں اور اُنہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتیں۔ اُن کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی اور ان کی روزانہ کی آمدنی میں مزید تخفیف کر دی جاتی۔ ایسے دکھیاروں کا پرسانِ حال کوئی نہ ہوتا اور پھر وہ مجبوراً ظلم کی اسی بھٹی میں جلنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ شوکت صدیقی نے اپنے ناولٹ ''کمین گاہ'' میں اسی صنعت کار طبقے کی عکاسی کی ہے جو اپنے کارندوں کے ذریعہ مزدوروں کے جائز حقوق پامال کراتے ہیں اور مزدوروں کو اپنا پیدائشی غلام سمجھتے ہوئے اُن پر ہر طرح کا ظلم روا رکھنا جائز سمجھتے ہیں۔ شوکت صدیقی لکھتے ہیں:

> ''استحصال کرنے والے طبقات ایک بار پھر برسرِ اقتدار آ گئے
> صرف چہرے اور نام بدل گئے۔ ہندو سرمایہ دار اور ساہوکار بھارت
> چلے گئے اور برطانوی نو آبادکار اپنی انگریز نوکر شاہی کے ساتھ
> برطانیہ گئے ان کی جگہ مسلمان جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور مسلم
> نوکر شاہی نے لے لی۔ استحصال کا یہ سلسلہ ختم ہونے کے بجائے
> زیادہ بے رحم اور شدید ہو گیا۔''(7)

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے حالاتِ زندگی اور عہد سے آگاہی کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں ادیبوں میں بہت زیادہ مماثلت ہے۔ دونوں کو بچپن سے مطالعہ کا شوق تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے دور کے ادب اور کلاسیکی ادب کے مطالعہ کے بعد خود بھی لکھنا شروع کیا دونوں ادیبوں نے اپنے ناولوں میں ظالم اور مظلوم کے درمیان کشمکش اور استحصال کو واضح کیا ہے۔ شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز دونوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ دونوں کے ناول رسائل میں قسط وار شائع ہوتے رہے۔ دونوں ناول نگاروں نے جرائم پیشہ افراد کی عکاسی اپنے ناولوں میں کی ہے۔ دونوں ناول نگاروں نے تشدد، پُراسراریت اور مشکوک قسم کے لوگوں کو ناول کے پس منظر میں گھات لگائے دکھایا ہے۔ اس تمام مماثلت کے باوجود دونوں میں گہرا فرق بھی موجود ہے چارلس ڈکنز معاشرتی مسائل کی عکاسی اس یقین کے ساتھ کرتا ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ماضی کی کہانی بن جائے گی۔ اور سچائی اور اچھائی اس کی جگہ لے لے گی۔ جبکہ شوکت صدیقی کے ہاں وہ اُمید اور Optimism نہیں پائی جاتی جو ڈکنز کی تخلیقات کا خاصہ ہے۔ دونوں میں یہ فرق اُن کے اپنے اپنے عہد کی پیداوار ہے۔ شوکت صدیقی غلام قوم کا فرد ہے۔ جبکہ ڈکنز حاکم قوم کا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ادیبوں کے نظریۂ حیات میں واضح فرق ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی دونوں معاشرتی ناول نگار ہیں۔ معاشرتی ناول نگار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو زندگی کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں۔ ایسے ناول نگار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زندگی کی تصویر کشی (Portrayal of Life) کرتے ہیں اس کے برعکس بعض ناول نگار زندگی کو دکھانے کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید (Criticism) بھی کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو ناانصافیوں اور دکھوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں اور اپنے ناولوں میں مثالی اور تصوراتی دنیا (Utopiac World) تخلیق کرتے ہیں، جس کا وجود حقیقی زندگی میں مفقود نظر آتا ہے، زندگی میں تبدیلی لانے والے ناول نگار کو انقلابی ادیب کہا جاتا ہے یعنی ایک ایسا ادیب جو معاشرے میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہو۔ وہ ظلم و جبر کے خلاف نظریاتی اور عملی طور پر برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کا شمار اسی دوسری قسم کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں ناول نگار طبقاتی تقسیم ناانصافیوں اور ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں۔

چارلس ڈکنز نے اپنے دور کے انگلستان کی عکاسی کرتے ہوئے صنعت کار کو غربا کے استحصال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان سے بہت زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ مگر انہیں قلیل معاوضہ ملتا تھا۔ ان کے لیے تفریح کے اوقات اور مواقع نہیں تھے۔ کارخانوں میں مناسب ہوا اور روشنی کا بندوبست بھی نہیں تھا۔ مزدور مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتے تو ان کی مدد نہ کی جاتی۔

غریب بچے کسی تحفظ کے بغیر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے خود چارلس ڈکنز کو اپنے بچپن کا کچھ حصہ ایک کارخانے میں مزدور بچے کے طور پر کام کرنا پڑا۔ بچپن کی تلخیاں اسے عمر بھر یاد رہیں۔ اس زمانے کی تلخیوں نے ڈکنز کے دماغ کو مستقل طور پر مجروح کر دیا۔ اور بچپن کے دکھوں اور محرومیوں کے ضمن میں اسے بڑا ناول نگار بنا دیا۔ وہ اکثر بچپن کے بھیانک خوابوں میں گم ہو جاتا تھا اور واپس زندگی کے ابتدائی ادوار میں مایوسیوں اور تاریکیوں کی پرچھائیوں میں چلا جاتا تھا۔ ان کا ذکر اس نے مختلف ناولوں میں کیا ہے۔ Pip، David Copperfield، Oliver Twist، Little Nell اور Paul Dombey ننھے بچوں کی صورت میں ایسے کردار ہیں جنہیں نامساعد حالات کی سختیاں جھیلنا پڑیں۔ انسان اپنے اندر اور باہر مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہے۔ اس کشمکش کی عکاسی ڈکنز کے ادیبانہ فن میں بخوبی کی گئی ہے بیرونی عوامل کو مختلف کرداروں کی تشکیل کا سبب دکھایا گیا ہے۔ زیر دستوں کو کچلنے والی ہولناک قوت کی کئی صورتیں ہیں مثلاً سرمایہ دار، یتیم خانے کی انتظامیہ، سوتیلا باپ اور صنعت کار، قوت اندھی ہوتی ہے اور بااختیار شخص کو ظالم بنا دیتی ہے۔ ڈکنز نے دل کی تاریکیوں کو ہر ممکنہ رنگ (Shade) میں دکھایا

ہے ۔ اس ضمن میں Miss.Havisham، Compeyson، Mr.Bumble اور Mr.Murdstone نمائندہ کردار ہیں۔ "The Dickens World"میں Humphry House نے "History Text Book" میں سے اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ ڈکنز بطور

''عظیم ناول نگار، اپنے دور کے دیگر ناول نگاروں کی طرح ایک مصلح تھا۔ اس کی کہانیاں خواہ اندوہناک ہوں یا مزاحیہ اس کے زمانے کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی برائیوں (Abuses) کے خلاف احتجاج ہیں۔''(8)

Humphry House آگے چل کر اپنے خیال کا اظہار یوں کرتا ہے۔

''ڈکنز کی تاریخ، ڈکنز کی اصلاح سے الگ نہیں۔ ڈکنز ماضی کی برائیوں کو بے نقاب کرنے سے خود دلچسپ اور جاذب توجہ بن گیا۔ ایسا کرنے میں کرسمس کی Harmony سی آ گئی ہے مقروضوں کو اب قید نہیں کیا جاتا۔ قرض دینے والوں کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے اور Parish-boy جو زیادہ خوراک کا تقاضا کرتا ہے اس کا طبی معائنہ کلینک میں کرایا جاتا ہے۔ نئے ایام پرانے ایام سے کافی بہتر ہیں اور ڈکنز نے اُنہیں بہتر بنانے میں مدد دی ہے''۔(9)

شوکت صدیقی نے بھی اپنے عہد کے مختلف پہلوؤں کو کچھ ایسے انداز سے دکھایا ہے کہ ادبی رنگ میں معاشرتی برائیاں منظر عام پر آ گئی ہیں تا کہ ان کا قلع قمع کیا جائے اور معاشرے کی اصلاح ہو۔ چنانچہ شوکت صدیقی نے زندگی کی روش پر تنقید کی ہے۔ اُنھوں نے زمینداروں کے عقوبت خانوں سے پردہ ہٹا کر دکھایا ہے کہ ان کے اندر کیسے مظالم ہو رہے ہیں ۔ معتوب مردوں، عورتوں اور بچوں کو کربناک سزائیں دی جا رہی ہیں۔ اُنہیں کن کن حربوں سے تکلیف پہنچائی جا رہی ہے کسی مظلوم سے کوئی معمولی سی غلطی سرزد ہوئی ہے تو اسے کتنی بڑی سزا دی گئی ہے۔ ظلم کا شکار ہونے والوں کو بھوکا، پیاسا رکھا جاتا ہے ان کی برداشت سے بڑھ کر ان سے مشقت کرائی جاتی ہے۔ ان کی حالتِ زار یہ ہوتی ہے کہ وہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں۔ بس دکھ پہ دکھ جھیلتے چلے جاتے ہیں اور اُن کی گردن قید با مشقت کے جوئے میں محبوس رہتی ہے۔ انسانیت کراہتی، چیختی، چلاتی، آہیں بھرتی اور سسکیاں لے رہی ہے۔

ڈاکٹر اے۔بی۔اشرف لکھتے ہیں۔

''شوکت صدیقی نے معاشرے کے تلخ پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔حسن وخیر،روشنی اوراجالے کی علم برداری کرنے والے تو بہت ہیں لیکن ظلمت،تاریکی اور بدصورتی کو گلے لگانے والے چند لوگ ہوتے ہیں،چمکتی چھلکتی چیزوں کو پیش کر کے ناظر کی آنکھوں کو خیرہ کرنا کمال نہیں، فنکاری تو یہ ہے کہ گری پڑی چیزوں کو حسنِ لازوال بخش دیا جائے۔''(10)

لاوارث بچوں کی حالتِ زار قاری کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ورکشاپوں میں معصوم بچے سارا دن کام کرتے ہیں۔بچپن زندگی کا سنہرا دور ہوتا ہے۔مگر ورکشاپوں میں کام کرنے والے بچوں کے لیے یہ زمانہ ڈراؤنا خواب بن گیا ہے۔بچپن تو کھیل کود،خوشیوں اور پڑھنے لکھنے کا دور ہوتا ہے مگر ورکشاپوں میں کام کرنے والے بچوں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے لیے گیند ہے اور نہ پڑھنے کے لیے کتاب۔اس کے برعکس ان کے سیاہی سے اَٹے ہاتھوں میں لوہے کے اوزار ہیں اور وہ میلے چیتھڑوں میں ملبوس ہیں۔لاوارث بچوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ان کے لیے گمراہی کے تمام راستے کھلے ہوئے ہیں۔وہ آوارگی محتاجی اور محرومی کی علامت بنے پھرتے ہیں۔لاعلم بچہ نشہ کرنے ،چوری کرنے ،جیب کترنے ،دھوکہ دہی جیسے جرائم کا مرتکب ہوجاتا ہے اور عادی مجرم بن جاتا ہے۔

شوکت صدیقی کا مشاہدہ ہے کہ معاشرے کی بھیانک حالت کا ذمہ دار سرمایہ داری نظام ہے۔

''پاکستان کے معروضی حالات میں تو تمام سیاسی اور اقتصادی برائیوں کی جڑ جاگیرداری نظام ہے۔''(11)

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی نے اپنے اپنے دور کی حالت زار پیش کی ہے۔دونوں نے امرا کے مظالم منظرعام پر لانے کی کوشش کی ہے۔دونوں کے ناولوں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کی تحریروں میں زندگی پر تنقید (Criticism of Life) کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں انقلابی ادیب کہا جا سکتا ہے۔ انقلابی ادیب میں مشاہدہ (Observation)،اظہار (Expression) اور سماجی مسائل کو حل کرنے میں اس کی عملی شرکت یہ تین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی انقلابی رائٹر کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ڈکنز کے ابتدائی حالات پسماندگی میں گزرے۔

شوکت صدیقی کو بھی پاکستان آنے کے بعد بے شمار معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن ان مسائل کو انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔دونوں ادیبوں نے انہی نامساعد حالات میں اپنے لیے راستہ بنایا ذاتی محرومیوں اور مسلسل جدوجہد کے علاوہ غربت کے مارے ہوئے مظلوم لوگوں کے پیہم مشاہدے نے ان پر ایسا اثر ڈالا کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں اسی طبقے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی دنیا کے غموں اور کشمکشِ حیات کی عکس بندی کرتے ہوئے ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما ہیں۔شوکت صدیقی عدل وانصاف اور انسانیت کا متلاشی ہے۔اور ڈکنز انسانیت کے حق میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔دونوں نے بے راہ روی اور جرائم کو چھپانے کی بجائے بے نقاب کیا ہے۔شوکت صدیقی مفلسی کے شکار اور حالات کے روندے ہوؤں کی عکس بندی کرتا ہے۔ڈکنز کی حقیقت نگاری کی بنیاد غربت کے دکھوں کا تصور ہے۔شوکت صدیقی نے قوم کو جھنجوڑ کر اس کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ڈکنز نے تھامس کارلائل کی طرح عوام کے ضمیر کو بیدار کیا ہے۔دونوں نے امیر کو Villain اور غریب کو دکھوں کے درمیان جینے والا ہیرو دکھایا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کا نظریۂ حیات دراصل ایک ناختم ہونے والی انسانی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔معاشرے میں بسنے والے افراد کی طبقاتی تقسیم اور اس پر معاشرے کے اعلیٰ طبقہ کا رویہ ہی دراصل انسانی صعوبتوں اور مصیبتوں کو جنم دیتا ہے۔یہی صعوبتیں انسان میں ظلم و جبر کے خلاف جہاد کی ترغیب دلاتی ہیں شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز دونوں انسانی زندگی کو اس کی تمام تر صلاحیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے معاشرتی ناانصافیوں سے دور ایک مثالی اور تصوراتی دنیا (Utopiac World) میں لے جانا چاہتے ہیں دونوں ہی دراصل انقلابی ادیب ہیں البتہ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈکنز کی انقلابیت میں ایک ابدی امید اور Optimism کا رنگ نظر آتا ہے۔جو شوکت صدیقی کے انتہائی تلخ اندازِ بیان میں مفقود ہے۔

عہدِ وکٹوریہ (1837-1901ء) کے تمام ناول نگاروں میں ڈکنز عظیم ناول نگار تھا۔جس نے قلم کے ذریعہ اس دور کی معاشرتی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی۔اس سے پہلے کسی مصنف نے نچلے درمیانی طبقے کو اپنے ناولوں کا موضوع نہیں بنایا۔وہ اُن سے الگ تھلگ اور بالاتر ہو کر اُن کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ انہیں میں سے ایک فرد کی حیثیت سے اور انہیں کی سطح سے معاشرتی صورتحال کا مطالعہ کرتا ہے۔ہمدردی اور تاثرات کا پورا گروہ اُس کی ناول نگاری میں بکھرا ہوا ہے۔غم کا اظہار ہو یا مزاح کا درمیانی طبقہ کے لوگوں پر قاری کی توجہ مرکوز کرنے میں اس کے فن کی عظمت ہے یہی اُس کی حقیقت نگاری کی مستقل بنیاد ہے۔شعور کی اندرونی وسعتوں میں روح کو مجروح کرنے والی

غربت کا دکھ محسوس ہوتا ہے۔ڈکنز نے اپنے ناولوں میں نہ صرف گرد وپیش کی زندگی کے الم انگیز پہلوؤں کو پیش کرنا اپنا فرض سمجھا بلکہ نسل انسانی کی بہبود کے لیے معاشرتی اصلاح بھی کی۔غریبوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والوں نے ڈکنز کو ہلا کر رکھ دیا۔اساتذہ کے ہاتھوں بچوں کی قابل رحم حالت، قیدیوں کی دکھ بھری زندگی اور عدالتوں کی ناانصافیاں، یہ وہ برائیاں تھیں جن کے خلاف ڈکنز نے قلم اُٹھایا۔اور معاشرتی اصلاح کے لیے باضابطہ طور پر ان برائیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ضرورت پر زور دیا۔ برائیوں کو منظرعام پر لانے کے لیے اُس نے طنز کو فنی حربہ کے طور پر استعمال کیا۔ناول "Oliver Twist"(1838ء) میں ڈکنز نے محتاج خانوں کے بُرے انتظام وانصرام کی نشاندہی کی ہے اُس نے بتایا ہے کہ بچے کس طرح جرائم پیشہ افراد کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔اس نے "Oliver Twist" کو نمونہ بنا کر تمام بچوں کی وکالت کی ہے۔"Nicholas Nickleby" (1839ء) اور "David Copperfield" (1850ء) میں ڈکنز نے سکولوں میں تعلیم کے نظام کا مشاہدہ کیا ہے اور Sqeers اور Creakle جیسے سخت دل اساتذہ پر طنز کیا ہے۔ناول "Little Dorrit" (1857ء) میں مصنف نے قرض داروں کی جیلوں اور قیدیوں کی قابلِ رحم حالت کو واضح کیا ہے جہاں اُنہیں دُکھ بھری زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔اس نے جیلوں اور قیدیوں کی حالت کو بہتر بنانے کی تجاویز دی ہیں۔ناول "Bleak House" (1853ء) میں وہ عدالتی نظام پر طنز کرتا ہے اور مقدمات کو طول دینے کی بجائے جلد انصاف مہیا کرنے پر زور دیتا ہے۔ "Hard Times" (1854ء) میں مصنف نے صنعت کاروں کی دولت سے محبت کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ "Dombey and Son" (1848ء) میں مصنف مادی زندگی کے ایک اور پہلو کو منظرعام پر لایا ہے جسے دولت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا غرور کہا جا سکتا ہے۔ڈکنز نے اپنے دور کی سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور صنعتی زندگی کی کمزوریوں پر طنز کیا ہے۔

ڈکنز انسانی زندگی کو دو اُلٹ صورتوں میں پاتا ہے۔لوگوں کا ایک طبقہ اپنی بالا دستی میں نمایاں ہے اور دوسرا طبقہ غربت اور پس ماندگی کا شکار ہے۔ پہلا طبقہ دوسرے طبقے پر ظلم ڈھاتا رہتا ہے اور اس کا ہر وقت اور ہر جگہ استحصال کرتا ہے۔معاشرتی ناانصافی کا شعور ڈکنز کا تصورِ حیات ہے۔ڈکنز کا یہ تصور محض خیالی نہیں بلکہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے اس کے عملی تجربے اور مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

> ''وہ سرمایہ دارانہ صنعت کاری کا مسلسل مخالف رہا۔اُس کی تخلیق کردہ ہر کتاب نہ صرف زندگی کی سچی دولت سے لبریز ہے بلکہ یہ ظلم

اورخودغرضی کی قوتوں پر کاری ضرب ہے۔"(12)

ڈکنز انسان دوست ادیب ہے وہ مردوں، عورتوں اور بچوں سے اُن کی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود اُن سے محبت کرتا تھا۔

شوکت صدیقی نے ایسا ادب تخلیق کیا جو اُنہیں ترقی پسند مصنفین کی صف میں شمار کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جرائم پیشہ افراد کی عکاسی کی ہے۔ غریب مزارعوں کو سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ظلم کا نشانہ بنتے دکھایا ہے۔ ظلم کی بھٹی میں سلگتے ہوئے افراد کی حالتِ زار پیش کرنا شوکت صدیقی کا مطمعٔ نظر ہے۔ وہ ظلم کے بھیانک رخ کو دکھا کر عوام کے دلوں میں ظالموں کے خلاف نفرت پیدا کراتے ہیں اور مظلوموں کی حالت کو بہتر بنانے کے خواہاں ہیں۔ شوکت صدیقی معاشرے کے وہ پہلو منظرِ عام پر لائے ہیں جنہیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اُن کے افسانوں اور ناولوں میں موجود دنیا ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہے۔ یہ متحرک تصویریں قاری کی آنکھوں پر پڑی ہوئی پٹی ہٹا کر اُسے زندگی کے تلخ حقائق سے روشناس کراتی ہیں۔ اُن کے ناولوں "خدا کی بستی"، "کمین گاہ" اور "جانگلوس" میں اُمرا کے مظالم منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

"جدید پاکستان میں شوکت صدیقی ان چند مصنفین میں سے ایک ہیں جن میں زندگی کے حقائق کو بیان کرنے کی جرأت موجود ہے۔"(13)

شوکت صدیقی کے ناولوں میں بھی دو طبقات نمایاں طور پر منظرِ عام پر آئے ہیں ایک ظالم طبقہ اور دوسرا مظلوم طبقہ۔ ظالم طبقہ ظلم و بربریت کی انتہائی حد پھلانگ جاتا ہے۔ ناولٹ "کمین گاہ" میں ترلوکی چند کے مظالم کی طویل فہرست ہے۔ وہ رام بلی کو مجرمانہ زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ اپنے منیجر نربدارائے کو قتل کر دیتا ہے۔ اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی پر قاتلانہ حملے کی کوشش کرتا ہے۔ مزدور یونین کے دفتر کو رام بلی کے ذریعہ آگ لگوا دیتا ہے اور آخر میں رام بلی کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔

ناول "خدا کی بستی" میں بہت سے ایسے مناظر ہیں جو دکھ اور غم سے لبریز ہیں۔ نیاز کے ذریعہ نوشا کی ماں "رضیہ" کا قتل ہیبت ناک اور تکلیف دہ ہے۔ عبداللہ جاوید لکھتے ہیں۔

"سلطانہ کی ماں کے کردار کی تخلیق میں انسانیت کے درد کی آمیزش کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ شاید ڈکنز کے علاوہ اور کسی ناول

نگار کے ہاں نہ مل سکے''۔(14)

نیاز نوشا کے پورے گھرانے کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ وہ معصوم انو کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ نوشا بھی نیاز ہی کی وجہ سے بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے۔ نیاز کی سوتیلی بیٹی سلطانہ اس کی داشتہ کہلاتی ہے۔ نوشا کو نیاز کے قتل کے بدلے میں چودہ سال قید با مشقت کی سزا ملتی ہے۔ اس معصوم کا بچپن گمراہیوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ نوشا کے ساتھیوں راجہ اور شامی کا انجام بھی انتہائی دردناک ہوتا ہے۔ راجہ کو کوڑھ کی بیماری لگ جاتی ہے۔ شامی رکشہ چلا چلا کر ٹی بی کا مریض بن جاتا ہے۔ ان بے آسرا بچوں کی قسمت میں محرومیاں اور تکلیفیں لکھ دی گئی ہیں۔ وہ ساری زندگی سکون کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور بالآخر اندھیری وادیوں میں کھو جاتے ہیں اُن کا بچپن تاریکیوں اور ظلمات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنے مضمون ''اردو ناول کا چارلس ڈکنز'' میں ناول ''خدا کی بستی'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''اُن کے اس ناول کو پڑھ کر بے اختیار انگریزی ناول نگار چارلس ڈکنز یاد آجاتا ہے۔ جو معاشرہ کے مظالم، جابر، منافق اور ریاکار کرداروں کی عکاسی میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ اُس نے بچوں پر ہونے والے ظلم کے حوالے سے سب کو بے نقاب کیا یہ اُس کے ناولوں ہی کا اعجاز تھا کہ انگلینڈ کی پارلیمنٹ نے بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے قوانین بنائے''۔(15)

شوکت صدیقی نے ڈکنز کی طرح معاشرے کے مظلوم افراد کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے اُنہوں نے عوام کی توجہ اُن حقائق کی طرف مبذول کرائی ہے جنہیں عموماً لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شوکت صدیقی کی ناول نگاری کا مقصود بہبود انسانی ہے وہ استحصال اور ناانصافی کو معاشرے کے لئے مُضر تصور کرتے ہیں شوکت صدیقی کے نزدیک ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی گمراہیوں اور مجرمانہ ذہنیت کا سبب اعلیٰ طبقہ کی بے حسی ظلم و جبر اور حد سے بڑھی ہوئی ناانصافیاں ہیں۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی دونوں معاشرتی ناول نگار ہیں۔ دونوں نے اپنے گردو پیش میں موجود زندگی کے اَلم انگیز پہلوؤں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ دونوں نے زندگی کی حقیقتوں کو آرٹ کے دبیز پردوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ دونوں ہی اس لازوال قوت کے علم بردار ہیں جو اَزل سے غم و آلام کو کم کرنا اپنا مقصدِ حیات

تصور کرتی ہے۔ دونوں کا مقصود بہبودِ انسانی ہے۔ جہالت، غربت اور بے روزگاری دونوں کے نزدیک تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اِس تمام مماثلت کے باوجود ڈکنز کو صدیقی اور صدیقی کو ڈکنز نہیں کہا جا سکتا۔ ڈکنز نہ صرف انفرادی احساسات، محسوسات اور خیالات کی بنا پر بلکہ اِن انتہائی انفرادی حالات و واقعات کی بنا پر جو قدرت نے صرف اور صرف اُسی کے مقدر میں لکھے تھے، ایک انتہائی جداگانہ، انفرادی، الگ تھلگ اور مخصوص نظریاتی شخصیت کا حامل تھا۔ کم و بیش یہی الفاظ صدیقی کی اپنی مخصوص نظریاتی شخصیت کی توجیح کے طور پر استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ کوئی بھی انسان کوئی دوسرا انسان نہیں ہوسکتا اگر ایسا ہوتا تو وہ اس دنیا میں نہ ہوتا۔ اس دنیا میں اُس کی موجودگی ہی اُس کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ لہٰذا ایک خاص حد کے بعد ڈکنز اور صدیقی علیحدہ علیحدہ، انفرادی شخصیت کے طور پر واضح نظر آتے ہیں دونوں کا تصورِ حیات ایک خاص نقطہ کے بعد جُداگانہ نظر آتا ہے۔ دونوں ادیب سماجی نقاد تو ہیں ہی لیکن دونوں کی مجموعی سماجی زندگی کے انجام کے بارے میں آراء اور قیاس آرائیوں میں گہرا فرق ہے۔

ہر علاقے اور ہر دور کا اپنا مخصوص ادبی کلچر اور روایت ہوتی ہے۔ ہر ادیب کا اس روایت میں اپنا مخصوص مقام ہوتا ہے اگرچہ ڈکنز اور صدیقی کا نظریۂ حیات آپس میں گہری مماثلت رکھتا ہے پھر بھی دونوں اپنے اپنے ادبی کلچر میں ایک مخصوص حیثیت کے حامل ہیں۔ آپس میں مماثلت کے باوجود دونوں کا علیحدہ علیحدہ ادبی کلچر اور روایت دونوں ادیبوں کو اپنا اپنا انفرادی مزاج اور فکر کا کسی حد تک جداگانہ انداز عطا کرتا ہے۔ یعنی دونوں ادیب سماجی نقاد تو ہیں ہی لیکن دونوں کی مجموعی انسانی زندگی کے انجام کے بارے میں آراء اور قیاس آرائیوں میں گہرا فرق ہے۔ یہ فرق دونوں کو اپنے اپنے علاقائی، ادبی اور سماجی کلچر کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔

ڈکنز جس دور میں پیدا ہوا اور جس دور میں اُس کی فکر پروان چڑھی وہ دور جدید انسانی علوم وفنون کی شروعات اور مذہبی و مافوق الفطرت توہمات کے اختتام کا دور تھا انسان اپنے اور کائنات کے اندر موجود اَن گنت امکانات سے آگاہ ہو رہا تھا۔ لہٰذا سماجی برائیوں اور انسانی ظلم وستم کے باوجود انسان تاریخ میں پہلی مرتبہ اُمید اور یقین کی لازوال دولت سے روشناس ہو رہا تھا۔ عہد وکٹوریہ (1837-1901) سماجی اونچ نیچ اور ظلم و جبر کا نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی سوچ کی تبدیلی اور مستقبل کی خوشی کا بھی علمبردار ہے۔ ڈکنز پر اپنے علاقے کی مجموعی سوچ کا اثر انداز ہونا بعید از قیاس بات نہیں۔ ڈکنز کا یہی علاقائی اندازِ فکر اُسے صدیقی کے نظریۂ حیات سے ممتاز کرتا ہے۔

عہدِ وکٹوریہ(1837-1901) کی منطقی Optimism اور اُمید ہمیں ڈکنز کے ناولوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہی Optimism ڈکنز کے ناولوں میں Backbone کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈکنز سماجی ظلم وستم کی عکاسی اس یقین کے ساتھ کرتا ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ماضی کی کہانی بن جائے گی یہ یقین شوکت صدیقی کے ناولوں میں مکمل طور پر مفقود ہے۔

شوکت صدیقی کا نظریۂ حیات اُس کے دور کی پیداوار ہے۔ صدیقی نے جس دور میں اور جس علاقے میں ادب تخلیق کیا وہ علاقہ جدید علوم وفنون سے عاری لوگوں کی آماجگاہ تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے فوراً بعد کے برصغیر میں انسانی زندگی تذلیل کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی اور انسانی سوچ کی کوئی سمت اور منزل نہیں تھی۔ سماجی ظلم و جبر کی وجہ سے Pessimism اور مایوسی کا پیدا ہونا ایک یقینی اَمر تھا۔ صدیقی بھی اپنی تخلیقات کو اس اجتماعی سماجی فکر سے محفوظ نہ رکھ سکا اور اپنے فن پاروں میں وہ توازن پیدا نہ کر سکا جو ڈکنز اور شیکسپیئر کی تخلیقات کا خاصہ ہے۔

ڈکنز کے ناولوں میں یقین، اعتماد اور اُمید کی فضا نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں معاشرتی برائیوں کو اس یقین کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ برائیاں صرف اور صرف ختم ہونے کے لیے ہیں اور بالآخر سچائی اور اچھائی ان کی جگہ لے لے گی۔ چارلس ڈکنز نے تین اپریل 1844ء کو J.V. Staples کے نام ایک خط میں لکھا۔

> ''مجھے غریبوں پر بڑا بھروسہ ہے میں اپنی ممکنہ بہترین اہلیت سے کوشش کرتا ہوں کہ اُنہیں اُمراء کے سامنے پسندیدہ صورت میں دکھاؤں اور ایسا کرنے سے میں کبھی باز نہیں آؤں گا۔ مجھے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک یہی اُمید ہے کہ میں اُن کے حالات کے پس منظر میں اُنہیں خوش کرنے اور عقلمند بنانے کی وکالت کرتا رہوں گا۔''(16)

ملکہ وکٹوریہ(1819-1901) ڈکنز کی وفات پر لکھتی ہیں۔

> ''اُس کی موت بہت بڑا سانحہ ہے۔ وہ محبت میں فراخ دل تھا اور غریب طبقوں سے بہت زیادہ ہمدردی رکھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف طبقات میں بہتر احساس،

جذبہ اور باہمی ربط پیدا ہو جائے گا اور میں دل سے دعا کرتی ہوں
کہ ایسا ہو۔''(17)

ڈکنز کے ناولوں میں Tragic Waste تو ہوتا ہی ہے لیکن آخر میں اچھائی برائی کو ختم کر کے اُس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ڈکنز کو یہ یقین ہے کہ برائی ختم ہونے کے لیے ہے اور ختم ہو کر رہتی ہے۔ قاری کو پورے ناول کے دوران ایک خاص قسم کا سکون، اطمینان اور طمانیت کا احساس رہتا ہے اس کا دل ہمہ وقت اس یقین کے ساتھ لبریز رہتا ہے کہ آخر میں فتح سچ کی ہوگی۔ یہ یقین اُسے عملی زندگی کی تکالیف سے یکسر باہر نکال لاتا ہے اور ایک ناقابلِ بیان آسودگی فراہم کرتا ہے یہ آسودگی ہی دراَصل اُس کا کیتھارسس کرتی ہے اور قاری زندگی کی تکالیف کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈکنز کے ناول المیہ نہیں بلکہ Melodrama طرز کی کہانی ہوتے ہیں جن میں وقتی تکالیف، غم و آلام کے ساتھ ساتھ، وقتی خوشی اور مستقل اُمید بھی پائی جاتی ہے جو ناول کے آخر میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ کسی بھی کہانی جس کا اختتام اُمید سے عاری نہ ہو مکمل Tragedy نہیں کہا جا سکتا۔ کہانی کے آخر میں پائی جانے والی اُمید دراصل انسانی نیکی کی بقا کی دلیل ہوتی ہے اور یہ کسی بھی کہانی کو Tragedy بنانے سے روکتی ہے ڈکنز کے تقریباً ہر ناول کا اختتام اُمید اور خوشی پر ہوتا ہے۔

اس کے برعکس ہمیں شوکت صدیقی کے ہاں معاشرتی غم و آلام کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ان میں ایک صحت مند تبدیلی کی خواہش تو نظر آتی ہے لیکن وہ یقین، اعتماد اور اُمید کی فضا کہیں نظر نہیں آتی جو ڈکنز کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ قاری اس طمانیت اور سکون کے احساس سے محروم رہتا ہے جو اُسے ڈکنز کے ناول پڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔ قاری کا دل مسلسل کڑھتا رہتا ہے اور طبیعت پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی ہے۔ کہانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ قاری پر بے دِلی اور خوف کی پرچھائیاں بھی مسلسل بڑھتی رہتی ہیں اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اُسے وہ ذہنی آسودگی حاصل نہیں ہوتی جو اُس کا کیتھارسس کر سکے۔

ڈکنز کے ہاں ہمیں برائی اور اچھائی کے درمیان توازن نظر آتا ہے اپنے ہاں ان دو قوتوں کو متوازن رکھنے کے لیے ڈکنز Poetic Lisence کی تکنیک کو استعمال کرتا ہے۔ ڈکنز کی دنیا میں اچھائی کا صلہ اچھائی اور برائی کا صلہ برائی ہے۔ یہ اندازِ فکر ہمیں صدیقی کے ناولوں میں مفقود نظر آتا ہے۔ اس کی دنیا میں اچھائی کا صلہ برائی ہے۔ طاقتور ہمیشہ کمزور کو کھا جاتا ہے۔ اور کمزور ہمیشہ کمزور ہی رہتا ہے۔ صدیقی کے نزدیک Poetic Lisence محض ایک غیر مرئی، غیر حقیقی اور غیر اہم سی شے بن کر رہ جاتا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں کا بغور جائزہ دونوں کے منفرد اندازِ فکر کا عکاس ہے ڈکنز کے ناولوں کے ٹائٹل ہی اپنے اندر ایک مخصوص رجائیت (Optimism) سموئے ہوئے ہیں۔

Our Mutual Friend, A Tale of Two Cities, Great Expectations

قاری کے ذہن کو خاص اور غیر مرئی طمانیت بخشتے ہیں۔ ڈکنز کے دوسرے ناولوں کے ٹائٹل اگر چہ رجائیت کے علمبردار نظر نہیں آتے تو ان میں قنوطیت کا پہلو بھی مفقود ہے۔ یعنی وہ غیر جانبدارانہ حد تک کسی بھی قسم کے احساس سے عاری نظر آتے ہیں کیونکہ وہ اکثر اوقات ناول کے ہیروز کے نام ہوتے ہیں۔

Oliver Twist, David Copperfield, Nicholas Nickleby, Little Dorrit, Pickwick Papers, Dombey and Son, Martin Chuzzlewit, The Mystery of__ Edwin Drood

ناولوں کے اہم ترین کرداروں کے نام ہیں اور ان ناولوں کو پڑھے بغیر قاری کسی بھی قسم کے جذبات ان کے ٹائٹل کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتا۔ ڈکنز کی یہ خوبی بھی اسے صدیقی کے تصورِ حیات سے ممتاز کرتی ہے۔ یعنی شوکت صدیقی کی خاص یاسیت سے لبریز سوچ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنا اظہار اُس کے ناولوں کے ٹائٹل میں کرتی نظر آتی ہے۔ ٹائٹل ''خدا کی بستی'' اپنے اندر طنز و تحقیر کے نشتر چھپائے ہوئے ہے۔ قاری کا ذہن خدا کی عظمت اور بستی کے چھوٹے پن میں موجود تضاد میں چھپے ہوئے مخصوص معنی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لفظ ''خُدا'' کا لفظ ''بستی'' کے ساتھ استعمال قاری کو حیرت میں ڈال کر اُس میں چھپی قنوطیت تک پہنچانے میں اُس کی مدد کرتا ہے۔ ٹائٹل ''خدا کی بستی'' اپنے اندر جو محسوسات سمائے ہوئے ہے ڈکنز کا سخت سے سخت ٹائٹل "Hard Times" بھی انہیں ادا کرنے سے قاصر ہے۔

ناولٹ ''کمین گاہ'' کا ٹائٹل جنگل کے قانون کی یاد تازہ کرتا ہے۔ قاری کا ذہن ٹائٹل کو دیکھ کر ہی مخصوص Connotations قائم کر لیتا ہے۔ شکاری، شکار اور موت کی مثلث ''کمین گاہ'' کا ایک منطقی نعم البدل بن کر قاری کے ذہن میں اُبھر آتی ہے اور یاسیت کے دبیز سائے گہرے ہو جاتے ہیں۔

ٹائٹل ''چار دیواری'' حفاظت کے احساس کی بجائے جدید قاری کے ذہن میں گھٹن، تنگی اور غلامی کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ اس کا ذہن بیرونی دنیا سے کٹ کر چار دیواری کے اندر کی دنیا کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ یوں اُس کی سوچ محدود ہو جاتی ہے۔

''جانگلوس'' صدیقی کی لفظی اختراع (Coinage) ہے۔ لفظ ''جانگلو'' کے آگے صدیقی کا ''س'' قاری کے

ذہن میں ''جانگلوس'' کے معنی ''جانگلو کی دنیا'' میں بدل دیتا ہے۔قاری جونہی لفظ ''جانگلوس'' پڑھتا ہےاس کے ذہن میں ''جانگلو کی دنیا'' گونجنے لگتی ہے اور وہ شعوری طور پر اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ ناول معاشرتی ناانصافیوں کے واقعات سے اَٹا پڑا ہوگا۔

جہاں تک چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کی کردار نگاری کا تعلق ہے دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ہمیں دونوں کے ہاں مکمل(Round) کردار نہیں ملتے کیونکہ اس کے لیے ادیب کو کرداروں کی بتدریج تبدیلی کی (ذہنی اور نفسیاتی سطح پر) توجیہہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ جو ڈکنز اور صدیقی کے ناولوں میں مفقود ہے۔

کردار نگاری کی بجائے وہ ناول کی بیانیہ تکنیک(Narrative Technique) پر زیادہ زور دیتے ہیں گو کہ ہمیں دونوں ناول نگاروں کے ہاں مکالمہ نظر آتا ہے لیکن صرف مکالمہ کردار نگاری کو جنم نہیں دے سکتا۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے کردار مکمل(Round) نہیں بلکہ سادہ (Flat) ہیں ۔ دونوں ناول نگاروں کے کردار حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے وجود میں آئے ہیں۔ دونوں کے ناولوں میں موجود کرداروں کا آپس میں تقابل کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے ناولوں میں کچھ کردار ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ان میں راجہ اور Oliver،نوشا اور Oliver، Fagin اور اُستاد پیڈرو، لالی اور Magwitch، رحیم داد اور Compeyson، علی احمد، Joe Gargrey اور Mr.Peggotty ایک دوسرے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈکنز اور صدیقی کی کردار نگاری میں بہت زیادہ مماثلت ہے۔

اسلوبِ بیان کے حوالے سے اگر ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں کا تنقیدی انداز میں تقابل کیا جائے تو مماثلت اور امتیازات کے بہت سے نکات سامنے آتے ہیں۔منظر نگاری اور مکالمہ نگاری میں صدیقی اور ڈکنز آپس میں مماثلت رکھتے ہیں۔ جہاں تک زبان کے استعمال اور مزاح نگاری کا تعلق ہے دونوں کا اپنا اپنا مخصوص انداز ہے ڈکنز کے ناولوں کی زبان جمالیاتی ادب کی زبان ہے جبکہ صدیقی اپنے ناولوں میں روزمرہ استعمال کے عامیانہ قسم کے جملوں کو بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز اس حد تک تو آپس میں مماثلت رکھتے ہیں کہ دونوں کے ناولوں میں اَن پڑھ اور اُجڈ طبقے کی گفتگو کا اظہار ملتا ہے۔لیکن دونوں میں جو واضح فرق ہے وہ یہ کہ ڈکنز کی تحریر آلائشوں سے پاک ہے اور ان کے ناولوں میں Obscenity نہیں جبکہ شوکت صدیقی کا ناول بالخصوص ''جانگلوس'' Obscenity سے

محفوظ نہیں۔

شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز کے ہاں مکالمہ نگاری کا فن اُن کے کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو اُجاگر کرنے سے قاصر ہے۔یعنی دونوں ادیبوں کا مکالمہ کردار نگاری میں کوئی مدد فراہم نہیں کرتا۔

دونوں ادیبوں کے ہاں ان کے کردار اپنے مزاج، موڈ اور فلاسفیز کو مکالمہ کے ذریعہ بیان کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں دونوں ادیبوں کے ہاں مکالمہ کہانی کے بہاؤ کو متاثر نہیں کرتا۔کرداروں کے درمیان ہر قسم کی غیر ضروری اور فالتو بحثوں سے گریز کیا گیا ہے۔

ڈکنز اور صدیقی دونوں کے ناولوں میں منظر کشی کی گئی ہے۔دونوں نے قدرتی مناظر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

ڈکنز کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت اس کا مزاحیہ انداز ہے۔ڈکنز کا یہ مزاحیہ انداز اسے شوکت صدیقی کے یاسیت بھرے انداز سے جدا کرتا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں کے پلاٹ مربوط نہیں ہیں۔دونوں مصنف رسائل میں قسط وار ناول لکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کے ناولوں میں ربط نہ رہا۔اشاعت کے لیے ہر قسط میں لفظوں کی مقررہ تعداد کے اندر لکھنے کی مجبوری اور ہر قسط کو نقطۂ عروج تک پہنچانا ضروری تھا تاکہ قاری کی دلچسپی قائم رہے یہی وجہ ہے کہ ناول کو جامع صورت نہ مل سکی۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے اسلوب کا تفصیلی جائزہ دونوں ادیبوں میں موجود مماثلت اور امتیازات کو نمایاں کرتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈکنز اور صدیقی کی ناول نگاری میں انتہا کی حد تک مماثلت ہے اگرچہ یہ مماثلت بعض اوقات نہیں ملتی لیکن کوئی بھی ناولسٹ کلی طور پر ایک دوسرے کا عکاس نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے دور اور اپنے تجربات کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ Ivor Brown "Dickens in His Time," P.1, Thomas Nelson and Sons Ltd, 1965.

2۔ Charles Dickens "The Mystery of Edwin Drood",
Oxford University Press, 1982.

3۔ Cliff's Notes, Dickens Pickwick Papers Notes, P.6,
C.K. Hillegass U.S.A 1970.

"Dickens was taken out of school and set to menial jobs about the household. In time, to help augment the family income, Dickens was given a job in a blacking factory among course companions."

4۔ رضی عابدی، ''ادب اور سماجی وابستگی'' ص:124، مشمولہ ''تیسری دنیا کا ادب'' لاہور، مکتبہ فکر و دانش، س ن۔

5۔ انوار احمد، ڈاکٹر ''اردو مختصر افسانہ اپنے سیاسی و سماجی تناظر میں'' (غیر مطبوعہ)، ص:378، مملوکہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، 1983۔

6۔ نجم الاسلام، ڈاکٹر، ''پاکستانی ادب اور پاکستان'' مشمولہ ''ادبی جائزے پانچویں کل پاکستان اہلِ قلم کانفرنس کے مقالات'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، 1986۔

7۔ شوکت صدیقی ''طبقاتی جدوجہد اور بنیاد پرستی'' ص:106، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1988۔

8۔ Humphry House, "The Dickens World", P.10,
Oxford University Press, 1971.

"The great novelist, like others of his time, was a reformer. His stories, whether sad or humorous, often served as a protest against the abuses of the social and political life of has time."

9۔ Ibid, P.10.

"Dickens history is inseparable from Dickens reformism .... and even accentuates an interest in Dickens's exposure of past abuses; self- congratulation harmonizes only too easily with the christmas spirit. Debtors are no longer jailed; money - lenders are more strictly supervised; and a parish boy who asks for more can be sent to a clinic for analysis. Good are the old days were, the new are in some ways better, and Dickens helped to make them so."

10۔ اے بی اشرف، ڈاکٹر، ''خدا کی بستی ......ایک عوامی ناول''، ص:76، مشمولہ ''ادب اور سماجی عمل'' ملتان، کاروانِ ادب، 1980۔

11۔ گلزار جاوید، ''براہِ راست'' ص:18، مشمولہ ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی، مارچ، اپریل 2001۔

12۔ A.E. Dyson (ed) "Dickens Modern Judgements," P.280,

Macmillan and Co. Ltd. 1968.

"He understood it with unwavering hostility. Every book he produced was not only a celebration of the true wealth of life, it was an attack on the forces of cruelty and selfishness."

13۔ Sagaree Sengupta, Shaukat Siddiqi Pakistan's Venerable Man of Letters, P.66, Persimmon Spring New York, 2001.

"Siddiqi is one of the few writers who have had the courage to describe the realities of life in modern Pakistan."

14۔ عبداللہ جاوید ''خدا کی بستی'' ص:48، ''نئی قدریں'' حیدرآباد، 1970۔

15۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''اردو ناول کا چارلس ڈکنز'' ص:23، مشمولہ ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی، شمارہ مارچ، اپریل 2001۔

16۔ Stephen Wall (ed) "Charles Dickens," P.66, Penguin Books, 1970.

"I have great faith in the poor; to the best of my ability. I always endeavour to present them in a favourable light to the rich; and I shall never cease, I hope untill I die, to advocate their being made as happy and as wise as the circumstances of their conditions in its utmost improvement, will admit of their becoming."

17۔ Philip Collins, "The Critical Heritage" P.502, New York Barnes and Noble INC, 1971.

"He is a very great loss. He had a large loving mind and the strongest sympathy with the poorer classes. He felt sure that a better feeling, and much greater union of classes would take place in time. And I prey earnestly it may."